



اشرف صبوحی

(1905 – 1990)

سید ولی اشرف نام اور صبوحی تخلص، ادبی دنیا میں اشرف صبوحی کے نام سے مشہور ہوئے۔ 11 مئی 1905 کو دہلی میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم گھر پر ہوئی۔ 1922 میں اینگلو عربک ہائی اسکول سے میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ اس کے بعد ادیب کامل، منشی فاضل، ایف اے اور بی اے کے امتحانات پرائیوٹ طور پر پنجاب یونیورسٹی لاہور سے پاس کر کے 1929 میں محکمہ ڈاک اور تار میں ملازم ہوئے۔

ابتداء میں بچوں کے لیے کہانیاں لکھیں۔ دہلی سے شائع ہونے والے ادبی رسالوں میں کئی مضامین شائع ہوئے۔ ایک ادبی ماہنامہ ”ارمغان“ بھی جاری کیا جو دو سال تک شائع ہوتا رہا۔ 1947 میں تقسیم ملک کے بعد لاہور (پاکستان) چلے گئے۔ ان کا انتقال کراچی میں ہوا۔

اشرف صبوحی نے دہلی کے روزمرہ با محاورہ نکسالی زبان میں ادبی مضامین اور افسانے لکھے اور تراجم بھی کیے۔ ”دلی کی چند عجیب ہستیاں“ اور ”غبارِ کارواں“ ان کے خاکوں کے مجموعے ہیں۔ ”جھروکے“ افسانوں اور خاکوں کا مجموعہ ہے۔ ”سلمیٰ“ (بغداد کا جوہری)، ”بن باسی دیوی“، ”دھوپ چھاؤں“، ”نگلی دھرتی“ اور ”موصل کے سوداگر“ انگریزی کے تراجم ہیں۔ ان کے علاوہ بیس سے زائد بچوں کی کہانیوں پر مشتمل کتابیں ہیں۔

مرزا چپاتی



5019CH11

خُدا بخشے مرزا چپاتی کو، نام لیتے ہی صورت آنکھوں کے سامنے آگئی۔ گورا رنگ، بڑی بڑی اُبلی ہوئی آنکھیں، لمبا قد شانوں پر سے ذرا جھکا ہوا، چوڑا شفاف ماتھا، تیموری ڈاڑھی، چنگیزی ناک، مغلی ہاڑ۔ لڑکپن تو قلعے کی درو دیوار نے دیکھا ہوگا۔ جوانی دیکھنے والے بھی ٹھنڈا سانس لینے کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ڈھلتا وقت اور بڑھاپا ہمارے سامنے گزرا ہے۔ لُٹے ہوئے عیش کی ایک تصویر تھی۔ رنگ روغن اُترا ہوا محمد شاہی کھلونا تھا جس کی کوئی قیمت نہ رہی تھی۔

کہتے ہیں کہ دلی کے آخری تاج دار ظفر کے بھانجے تھے۔ ضرور ہوں گے۔ پوتڑوں کی شاہ زادگی ٹھیکروں میں دم توڑ رہی تھی، لیکن مزاج میں رنگیلا پن وہی تھا۔ جلی ہوئی رسی کے سارے بل گن لو۔ جب تک جیسے پرانی وضع کو لیے ہوئے جیسے۔ مرتے مرتے نہ کبوتر بازی چھوٹی، نہ پتنگ بازی۔ مرنے لڑائے یا بلبل، تیراکی کا شغل رہا یا شعبدے بازی کا۔ شطرنج کے بڑے ماہر تھے۔ غائب کھیلتے تھے۔ خدا جانے غدر میں یہ کیوں کر بیچ گئے اور جیل کے سامنے والے خونِ دروازے نے ان کے سر کی بھینٹ کیوں نہ قبول کی؟ انگریزی عمل داری ہوئی۔ بدامنی کا کوئی اندیشہ نہ رہا تو مراحم خسروانہ کی لہر اُٹھی۔ خاندانِ شاہی کی پرورش کا خیال آیا پیشین مقرر ہوئیں۔ مگر برائے نام۔

لیکن صاحبِ عالم مرزا فخر الدین عرف مرزا فخر و الملقب بہ مرزا چپاتی نے مردانہ وار زندگی گزاری۔ گھر بار جب کبھی ہوگا، ہوگا۔ ہماری جب سے یاد اللہ ہوئی دم نقد ہی دیکھا۔ قلعے کی گود میں بازیوں کے سوا اور سیکھا ہی کیا تھا جو بگڑے وقت میں آبرو بنانا۔ اپنے والد رحیم الدین حیا سے ایک فقط شاعری ورثے میں ملی تھی، پڑھنا لکھنا آتا نہ تھا۔ پھر زبان تو تلی مگر حافظہ اس بلا کا تھا کہ سو سو بند کے مسدّس از بر تھے۔ کیا مجال کہ کہیں سے کوئی مصرع بھول جائیں۔ گویا گراموفون تھے، کوک دیا اور چلے۔

ایک دن کسی شخص نے مرزا صاحب کے سامنے یہ مصرع پڑھا

سرِ عدو کا ہونہیں سکتا میرے سر کا جواب

اور اس پر مصرع لگانے کی فرمائش کی۔ مرزا صاحب نے اسی وقت بہترین مصرع لگا کر اس طرح ایک اعلا پایہ کا شعر بنا دیا۔

شہ نے عابد سے کہا بدلہ نہ لینا شمر سے

سرِ عدو کا ہونہیں سکتا میرے سر کا جواب

قلعہ مرحوم کے حالات اور موجودہ تہذیب پر اُن کی نوکا جھونکی جتنی مزہ دیتی تھی، وہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ کبھی کبھی وہ مجھے پتنگ بازی کے دنگلوں میں لے جاتے تھے۔ مُرغ اور بلبلوں کی پالیاں بھی دکھائیں۔ تیراکی کے میلوں میں بھی لے گئے۔ کبوتر بھی مجھے دکھا دکھا کر اڑائے۔ سب کچھ کیا، میں جہاں تھا وہیں رہا۔ ہر جگہ اُن کا دماغ کھایا۔ انھیں بھی میری خاطر ایسی منظور تھی کہ بادل خواستہ یا ناخواستہ وہ سب کچھ مجھے بتاتے۔

ایک دن دوپہر کے کوئی دو بجے ہوں گے۔ برسات کا موسم تھا۔ کئی گھنٹے کی موسلا دھار بارش کے بعد ذرا بادل چھٹے تھے کہ حضرت معمول کے خلاف میرے پاس تشریف لائے۔ مَنہ بنا ہوا، آنکھیں اُبلتی ہوئی۔ چہرے سے غصہ ٹپک رہا تھا۔ میں نے کہا خدا خیر کرے۔ آج تو صاحبِ عالم کے تیور کچھ اور ہیں۔ کئی منٹ تک خاموش بیٹھے رہے اور میں ان کا مَنہ تکتا رہا۔ ذرا سانس درست ہوا تو بولے ”سید! اس پٹھانچے کا ٹر مغز اپن بھی دیکھا۔ بڑا افلاطون بنا پھرتا ہے۔ باوا تو جھک جھک کر مجرا کرتے کرتے مر گیا، یہ بابو بن کر بابو کی طرح دُلتیاں جھاڑتا ہے۔ ہے شرط کہ چار جامہ کس دوں، ساری ٹرفش نکل جائے گی۔“

میں : میں بالکل نہیں سمجھا۔ ہوا کیا؟ کون پٹھانچہ؟

مرزا : ایسے ننھے سمجھے ہی نہیں۔ میاں! وہی کالے خاں کا لڑکا جو کچھری میں نوکر ہے۔

میں : منیر۔ کیا اس نے کچھ گستاخی کی؟

مرزا : گستاخی! نہ ہوا ہمارا زمانہ، خاندان بھر کو کولھو میں پسوا دیتا۔

میں : بڑا نالائق ہے۔ کیا بات ہوئی؟

مرزا : ہوا یہ کہ میں کبوتروں کا دانہ لینے نکلا۔ گلی کے کنڈ پر پیسے کی دُکان ہے۔ نالیوں میں دھائیں دھائیں پانی بہہ رہا تھا۔ ساری گلی میں کیچڑ ہی کیچڑ تھی۔ محلّے والوں نے جا بجا پتھر رکھ دیے تھے کہ آنے جانے والے ان پر پاؤں (پاؤں) رکھ کر گزر جائیں۔ دیکھتا کیا ہوں وہ اکڑے خاں بیچ گلی میں کھڑے ہوئے ایک خوانچے والے سے جھک جھک کر رہے ہیں۔ گلی تنگ، کیچڑ اور پانی۔ پتھروں پر ان کا قبضہ۔ کوئی بھلا اس پر گزرے تو کہاں سے؟ میں نے کہا کہ میاں راستہ چھوڑ کر کھڑے ہو۔ یہ کون سی انسانیت ہے کہ سارا راستہ روک رکھا ہے۔ ٹڑا کر جواب دیا کہ چلے جاؤ۔ مجھے تاؤ آ گیا۔ بولا کہ تمہارے سر پر سے جاؤں۔ بس پھر کیا تھا جامے سے باہر نکل پڑا۔ وہ تو پاس پڑوس کے دو چار آدمی نکل آئے اور بیچ بچاؤ کر دیا ورنہ آج یا وہ نہیں تھا یا میں۔ خیر جاتا کہاں ہے۔ آج کے ٹھپے آج ہی نہیں جلا کرتے۔

میں : صاحبِ عالم! آپ اپنی طرف دیکھیے۔ جو ظرف میں ہوتا ہے وہی چھلکتا ہے۔ آنے دیجیے وہ ڈانٹ بتاؤں کہ ہاتھ جوڑتے

بنے..... سنا ہے کہ قلعے کے آخری دور ہی میں شہر کی حالت بدل گئی تھی۔ نہ چھوٹوں کا رکھ رکھاؤ رہا تھا نہ بڑوں کا ادب۔

مرزا : تو بہ تو بہ تم نے تو دلی کو دم توڑتے بھی نہیں دیکھا۔ اس کا مردہ دیکھا ہے۔ مُردہ، وہ بھی لاوارث! میاں شہر آبادی کی باتیں قلعے والوں کے صدقے میں تھیں۔ جیسے جیسے وہ اُٹھتے گئے دلی میں اصلیت کا اندھیرا ہوتا گیا۔ اب تو نئی روشنی ہے نئی باتیں۔ اور تو خدا بخشے دلی کی صفتیں تم کیا جانو۔ پڑھے لکھے ہو۔ شاعری کا بھی شوق ہے۔ بھلا بتاؤ تو سہی اُردو کی کتنی قسمیں ہیں؟ میں نے حیران ہو کر پوچھا ”صاحبِ عالم اُردو کی قسمیں کیسی؟ یہ بھی ایک کہی۔ مجھ پر بھی داؤ کرنے لگے۔“ ”واہ بھئی معلوم ہوا کہ تم دلی والے نہیں۔ کہیں باہر سے آکر بس گئے ہو۔“ میں شرمندہ تھا کہ کیا جواب دوں۔ میرے نزدیک تو صرف ایک ہی قسم کی اُردو تھی۔ زیادہ سے زیادہ عوامِ دُخواس کا فرق سمجھ لو۔ مگر یہ قسمیں کیا معنی؟ مجھے چپ دیکھ کر مرزا مُسکرائے اور کہنے لگے ”سید پریشان نہ ہو۔ مجھ سے سُن اور یاد رکھ۔ بھولیوں نہیں پھر پوچھے گا تو نہیں بتاؤں گا۔“ میں بڑے شوق سے متوجہ ہوا اور انھوں نے انگرکھے کے دامن سے مُنہ پونچھ کر کہنا شروع کیا۔ دیکھ اوّل نمبر پر تو اُردوئے معلّٰی ہے جس کو ماموں حضرت اور اُن کے پاس اٹھنے بیٹھنے والے بولتے تھے۔ وہاں سے شہر میں آئی اور قدیم شرفا کے گھروں میں آچھپی۔ دوسرا نمبر قلّ آعوذ اُردو کا ہے جو مولویوں، واعظوں اور عالموں کا گلا گھوٹی رہتی ہے۔ تیسرے خود رنگی اُردو۔ یہ ماں ٹینی باپ کلنگ والوں نے رنگ برنگ کے بچے نکالے ہیں۔ اخبار اور رسالوں میں اسی قسم کی اُردو، ادب کا اچھوتا نمونہ کہلاتا ہے۔ چوتھے ہُردنگی اُردو، مسخروں اور آج کل کے قومی بلم بلمیوں کی مُنہ پھٹ زبان ہے۔ پانچویں لفنگی اُردو ہے جسے آکا بھائیوں کی لٹھ مار، کڑا کے دار بولی کہو یا پہلوانوں، کرخنداروں، ضلع جگت کے ماہروں، پھبتی بازوں اور گلبروں کا روزمرہ۔ چھٹے نمبر پر فرنگی اُردو ہے جو تازہ ولایت انگیز۔ ہندستانیوں عیسائی ٹوپ لگائے ہوئے کرائی، دفتر کے بابو، چھاونیوں کے سوداگر وغیرہ بولتے ہیں۔ پھر ایک سر بھنگی اُردو ہے یعنی چرسیوں، بھنگڑوں، بے نواؤں اور تکیے داروں کی زبان۔“ میں نے کہا آج تو بہرہ کھلا ہوا ہے۔ بھئی خوب تقسیم ہے کیوں نہ ہو، آخر شاہ جہانی دیگ کی کھرچن ہے۔ میری طرف دیکھ کر ایک گہرا اٹھنڈا سانس بھرا۔ آنکھوں میں آنسو آ گئے اور کہنے لگے ”سید! ابھی تم نے کیا دیکھا ہے اور کیا سنا ہے۔ قلعہ آباد ہوتا، دربار دیکھے ہوتے تو اصلی زبان کا بنا و سنگار نظر آتا۔ اب تو ہماری زبان بیسنی ہو گئی ہے۔ وہ لچیلی چونچلے کی باتیں، شریفوں کے انداز، امیروں کی آن، سپاہیوں کی اکڑفوں، وہ خادمانہ اور خوردانہ آداب و انکسار، شاعروں کے لچھے دار فقرے، شہر والوں کا میل جول، پرانے گھرانوں کے رسم و رواج، وہ مروت وہ آنکھ کا لحاظ کہاں؟ مجلسوں محفلوں کا رنگ

بدل گیا، میلے ٹھیلے، پرانے کرتب، اگلے ہنر سب مٹتے جاتے ہیں۔ اشراف گردی نے بھلے مانسوں کو گھر بیٹھا دیا۔ فیل نشین، پاکلیوں میں بیٹھنے والے کھریلوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ مفلسی، ناداری نے رذالوں کے آگے سر جھکوا دیے۔ موری کی اینٹ چوبارے چڑھ گئی۔ کم ظرفوں، ٹینیوں کے گھر میں دولت پھٹ پڑی۔ زمانہ جب کمینوں کی پشتی پر ہو تو خاندانیوں کی کون قدر کرتا؟ پیٹ کی مار نے صورتیں بگاڑ دیں، چال چلن میں فرق آ گیا۔ ہمت کے ساتھ حمیت بھی جاتی رہی۔

مرزا نے یہ تقریر کچھ ایسے عبرت خیز لفظوں میں کی کہ میرادل بھرا آیا اور میں نے گفتگو کا پہلو بدلنے کی کوشش کی۔

میں : کیوں حصّہ، غدر سے پہلے دلی والوں کا لباس کیا تھا؟ دو چار پرانی وضع کے لوگ دیکھنے میں آئے ہیں۔ اُن کی برزخ تو کچھ عجیب ہی سی معلوم ہوتی تھی۔

مرزا : جھوٹے ہو تم نے کہاں دیکھا ہوگا۔ کوئی بہروپیایا نقال نظر آ گیا ہوگا۔ میاں اُن وقتوں میں ادنا اعلا میں یک رنگی نہ تھی..... درباری اور بازاری لوگ لباس سے پہچانے جاتے تھے۔ عام طور پر اپنی شکل و شباهت، تن و توش، جسامت اور پیشے کے مطابق کپڑا پہنا جاتا تھا کہ دور سے دیکھ کر پہچان لیں کہ کس خاندان کا اور کیسا آدمی ہے؟ اگر نو جوان ہے تو ایک ایک ٹانگے پر جوانی برستی ہے۔ بوڑھا ہے تو پیری اور سادگی نکلتی ہے۔ بانکوں کا بانک پن، چھیلاؤں، ملاؤں کی ملائی، پہلوانوں کی پہلوانی، رذالوں کی رذالت اور شریفوں کی شرافت لباس سے صاف بھانپ لی جاتی تھی۔ چھوٹے آدمی جس پوشاک کو اختیار کر لیتے تھے، بھلے مانس چھوڑ دیتے تھے۔ دو پلڑی ٹوپوں کا عام رواج تھا مگر چوگوشی، پنج گوشی، گول، مغلی، تاج دار ٹوپیاں، مغل بچے اور شریف زادے پہنتے تھے۔ قلعے کے آنے جانے والوں میں مندلیں، بنارس دوپٹے، گولے دار پگڑیاں۔ مسلمانوں کا حصّہ تھا۔ درباری جامہ بھی پہنا کرتے تھے۔ اُمر اچھے سر پہنچ اور شہزادوں میں کلغیاں بھی مروج تھیں۔ ہندوؤں میں پہلے جامے کا زیادہ دستور تھا، پھر نیم جامہ اور اُلٹی چولی کے انگر کھے پہننے لگے۔ علاوہ ازیں الحلق، اچکن، قبا، عبا، جبہ، چغہ، مرزی وغیرہ بھی استعمال ہوتے تھے۔ پایجامے یا تو تنگ موری کے یا اک برے یا غرارے دار ہوتے تھے۔ ڈاڑھی مونچھوں کی وضع بھی ہر خاندان اور ہر پیشہ ور کی علاحدہ تھی۔

میں : مگر یہاں والوں کو فضول کھیلوں، دولت کو لٹانے والی بازیوں اور بے کار مشغلوں کے سوا کام ہی نہ تھا۔

مرزا : تم کیا جانو کہ وہ بازیاں اور اُن کے مشغلے کیسے کمال کے تھے۔ ویسے ہنر آج کوئی نہیں پیدا کر لیتا۔ زہرہ پھٹ جائے زہرہ۔ بات یہ ہے کہ ساری چیزیں وقت سے ہوتی ہیں۔ نامردوں کا زمانہ ہے تو نامردوں کی سی باتیں بھی ہیں۔ شریفوں کا مشغل ڈنڈ، گلدرد، بانک، بٹوٹ، پھلکیتی، انگنگ، تیر اندازی، نیزہ بازی، پنج کشی تھا۔ کہہ دو بے کار تھا۔ تیراکی، کشتی، شکرے اور باز

کا شکار، پتنگ لڑانا، کبوتر بازی وغیرہ سے دل چسپی تھی۔ کہہ دو یہ بھی فضولیات ہیں۔

میں : فضولیات نہیں تو اور کیا ہیں؟

مرزا : جی ہاں فضولیات ہیں۔ خدا کے بندے ان ہی باتوں سے تو دلی دلی تھی۔ ورنہ شاہجہاں کی بسائی ہوئی محمد شاہی دلی اور خورجہ بلند شہر میں کیا فرق۔ پھلکیت اور بتوٹے ایسے ہوتے تھے کہ موقع پڑتا تو رومال میں صرف پیسا یا ٹھیکری باندھ کر حریف کے سامنے آجاتے اور دو جھکائیوں میں ہتھیار چھین لیتے۔ تیرا کی کا یہ حال تھا کہ پالتی مارے ہوئے پانی پر بیٹھے ہیں جیسے مسند پر..... دھواں اڑاتے اور ملہار سنتے چلے جاتے ہیں۔ قلعے کی حمام والی نہر تو دیکھی ہوگی۔ گز سوا گز کا پاٹ ہے اور بالشت بھر سے زیادہ گہرائی نہیں۔ اس میں آج کوئی مائی کا لال تیر کر دکھائے تو میں جانوں۔ میری مچھلی تو خیر استاد تھے، ان کا سا کمال تو کسے میسر ہے۔ دو چار گز تو اتنے پانی میں تیر کر میں بھی دکھا سکتا ہوں۔

میں : اجی جناب آپ ریت پر تیریے، حبابوں پر کھڑی لگائیے، نتیجہ؟ کھیل ہی تو تھے۔ پھر یہ کبوتر بازی، پتنگ بازی، مرغ بازی، مینڈھے بازی کیا بلا تھی؟ پچارے بے زبانوں کو لہو لہان کرنا اور اپنا دل بہلانا کیا اچھے ہنر تھے۔

مرزا : ارے میاں ایرانی تورانی مچلے، دہم ہو کر کیا چوڑیاں پہن لیتے۔ جنگ و جدال کا خیال انسانی قربانیوں، ملک ستانیوں کے چاؤ، خون کی پچکاریوں سے ہولی کا وقت تو لد گیا تھا۔ نہ ان پر کوئی چڑھ کر آتا تھا نہ یہ کہیں چڑھائی کرتے تھے۔ انگریزی عمل داری کی برکت سے نکسیریں بھی نہیں پھوٹی تھیں۔ وہ جانوروں کو ہی لڑا کر اپنے دل کی بھڑاس نکال لیتے تھے۔

میں کچھ اور کہنے والا تھا کہ مرزا نے ایک ٹھہر ٹھہری لی اور یہ کہتے ہوئے کہ بھئی غضب ہو گیا شام ہونے آئی۔ کبوتر بھوکے میری جان کو رو رہے ہوں گے اور چوک کا وقت بھی آگیا ہے۔ لال بند کا جوڑا لگانا ہے، یہ جاوہ جا۔

ان باتوں کو کوئی ایک مہینا گزرا ہوگا کہ صبح ہی صبح مرزا صاحب چلے آتے ہیں۔ آتے ہی فرمانے لگے ”پرانی عید گاہ چلنا ہوگا۔“ میں نے کہا ”خیریت؟“ بولے ”لکھنؤوں سے پٹنچ ہیں۔ جانوں ڈھیری یا مالوں ڈھیری۔ پانچ روپیے، پٹنچ ٹھہرا ہے، بڑا معرکہ ہوگا۔“ میں نے عرض کیا ”صاحبِ عالم مجھے نہ تو پتنگ بازی سے کوئی دل چسپی ہے نہ میرے پاس اتنا فضول وقت ہے کہ آپ کے ساتھ واہی تباہی پھروں۔“ تاؤ کھا کر آنکھیں نکال لیں اور حاکمانہ انداز سے کہنے لگے ”تمھاری اور تمھارے وقت کی ایسی تہیسی۔ بس کہہ دیا کہ چلنا ہوگا۔ دوپہر کو آؤں گا تیار رہنا۔“ میں بہت پریشان ہوا مگر کرتا کیا، دوستی تھی یا مذاق۔ قہر درویش بجان درویش۔ اپنی ساری ضرورتوں کو طاق پر رکھا اور حضرت مرزا چپاتی کا منتظر تھا کہ ٹھیک بارہ بجے آواز پڑی ”سید آؤ۔“ آگے آگے مرزا صاحب اور پیچھے پیچھے میں۔ اجیری دروازے سے نکل کر قبرستان لاگتے پھلانگتے پرانی عید گاہ پہنچے۔ وہاں دیکھا تو خاصا

میلا لگا ہوا ہے۔ کبابی، کچا لو والے، دہی بڑوں کی چاٹ، پان بیڑی، پانی پلانے والے سقے، پوری خرافات موجود ہے۔ جابجا پتنگ بازوں کی ٹکڑیاں بیٹھی ہیں۔ مرزا صاحب کو دیکھتے ہی ”صاحب عالم ادھر“، ”مرزا صاحب ادھر“، ”اُستاد پہلے میری سن لیجیے“، ”میاں ادھر آنے دو۔ بات سمجھتے ہیں نہ بات کی دُم، اُڑنے سے کام۔“ ”ھٹ آپ یہاں آئیے۔ میرا کنکٹا آپ سے کچھ کہنا چاہتے ہیں۔“ چاروں طرف سے آوازیں پڑنے لگیں۔ مرزا چونکے ایک ایک کو جواب دیتے، شامیانے کے نیچے جہاں میرا کنکٹا تشریف فرما تھے، پہنچے۔

میرا کنکٹا لکھنؤ کے واجد علی شاہی پتنگ باز تھے۔ کا کریزی رنگ، گول چہرہ، چھوٹی چھوٹی آنکھیں، بڑی ناک، دانتوں میں کھڑکیاں، سر پر کڑ بڑے پتھے۔ خشخاشی ڈاڑھی، چھاتی کھلا، سنخاف دار ڈھیلا ڈھالا انگرکھا، سر پر دو انگل کی کلابٹو کے حاشیے کی ٹوپی، پاؤں میں مخملی گرگابی، کتے میں گھوری، اُٹھ کر مرزا چپاتی سے بغل گیر ہوئے۔ پھر جو پتنگ بازی کا ذکر شروع ہوا تو تین بج گئے۔ میں بے وقوفوں کی طرح بیٹھا ہوا ایک ایک کامنہ تک رہا تھا۔ پتنگ بازی کی ہوتی تو اُن کی اصطلاحیں سمجھ میں آتیں۔ آخر خدا خدا کر کے لوگ اپنی اپنی ٹکڑیوں میں گئے۔ آسمان پر چیل کوئے منڈلانے شروع ہوئے۔ میں مرزا صاحب کے ساتھ تھا۔ عید گاہ کی دیوار کے نیچے سے اُنھوں نے بھی اپنا اختر اختر کھول کر ایک انگارا اڑھا اڑایا۔ چُکا ایک لڑکے کے ہاتھ میں تھا۔ کوئی دس منٹ تک جھکایاں دیتے رہے، پتچ ہوا۔ کبھی آگے بڑھتے تھے کبھی پیچھے ہٹتے تھے۔ ایک دفعہ ہی جھلا کر لڑکے کو تمانچا رسید کیا اور بولے ”ابے چُکا پکڑنے کی سُر ت بھی نہ تھی تو یہاں آن کیوں مرا آخر کٹوا دیا نا۔“

پھر ایک الفن بڑھائی اور اب کے چُکا پکڑنے کی خدمت مجھے انجام دینی پڑی۔ بد قسمتی سے یہ گڈی بھی کٹ گئی۔ بہت بگڑے کہ بس جب تم جیسے منحوس ساتھ ہوں تو ہم اڑا چکے۔ غضب ہے سانولیا ہمیں اُستاد کہنے والا، میرا گولنداز ہمارے ہاں کے شاگرد، شیخ پیچک جیسے برابر پتچ نکالے جاتے ہیں اور مرزا فخر و اوپر نیچے دو کنکٹوے کٹوائے۔ ”سمیٹو میاں سمیٹو مجھے اپنی استاد کی تھوڑی گنوانی ہے۔“ وہ کہتے رہے، میں تو وہاں سے ہٹ کر رومال بچھا کر الگ جا بیٹھا۔ تھوڑی دیر میں وہ بھی اپنا اسبابِ جہالت لنگی میں باندھے میرے پاس آ بیٹھے۔ تیوری پر بل تھے، چہرہ سُرخ، آنکھیں اُبلی ہوئی۔ میں نے کہا مرزا صاحب ہوا کا کھیل ہے۔ اس میں کسی کی کیا پیروی۔ آپ کی اُستادی میں کہیں فرق آتا ہے۔ سلطنت ہی جب ہتھے پر سے کٹ گئی تو ان دو کاغذ کے ٹکڑوں کا کیا غم! آپ، آپ ہی ہیں۔ کہنے لگے ”سچ کہتے ہو میاں۔ ہم قلعے والوں کی تقدیر ہی خراب ہے۔ ہوا بھی موافقت نہیں کرتی۔ میں نے اُن کے بشرے سے اُن کی دلی تکلیف کا اندازہ کرتے ہوئے اس ذکر کو موقوف کر دیا۔ اور پوچھا ”کیوں مرزا صاحب قلعہ جب آباد تھا اس وقت بھی پتنگ بازی کے ایسے ہی دنگل ہوتے تھے؟“

مرزا : اک دھوپ تھی کہ ساتھ گئی آفتاب کے۔ اس وقت کا سماں کیوں کر دکھاؤں۔ میاں ہر بات میں اک شان تھی، ایک قاعدہ تھا اور ہزاروں غریبوں کی روٹیوں کے سہارے۔ معمول تھا کہ عصر کا وقت ہوا اور سلیم گڑھ پر جمگھٹ لگا۔ بڑے بڑے پتنگ، دوتاوی اور سہ تاوی نکلتیں، ڈور کی چرخیاں لے کر شاہی پتنگ باز پہنچ گئے، خلوت کے امیر اور شوقین شہزادے مرزا نبو، مرزا کدال، مرزا کالین، مرزا چڑیا، مرزا جھری بھی آ موجود ہوئے۔ یہ سلاطین زادے بہت منہ چڑھے تھے۔

میں : (بات کاٹ کر) حُصّت یہ نام کیسے؟ کیا اسی بولی کا نام اردوے معلّٰی ہے؟

مرزا : کچھ پڑھا لکھا بھی، یا گھاس ہی کھودتے رہے ہو۔ ارے زبان کی نکسال قلعے ہی میں تو تھی وہاں محاورات نہ ڈھلتے تو کہاں ڈھلتے۔ طبیعتیں ہر وقت حاضر رہتی تھیں۔ ہر بات میں جدّت مدّ نظر تھی۔ ہنسی مذاق میں جو منہ سے نکل گیا گویا سکہ ڈھل گیا۔ کسی کے پھٹے پھٹے دیدے ہوئے مرزا بٹو کہہ دیا۔ لمبا چہرہ، چنگی ڈاڑھی دیکھی، مرزا چکّا یا مرزا کدال کہنے لگے۔ چکلے چہرے والے پر چوپال کی اور ٹھٹکنے پر گھٹنے کی بھتی اڑا دی۔ غرض کہ مرزا چیل، مرزا جھپٹ، مرزا یا ہو، مرزا رنگیلے، مرزا ریلے، بیسوں اسم با مسمیٰ تھے۔ میں جمعرات کو چپا تیاں اور حلوا بانٹا کرتا تھا، میرا نام مرزا چپاتی مشہور کر دیا۔

میں : لیجئے ہمیں آج تک مرزا چپاتی کی وجہ تسمیہ ہی معلوم نہ تھی۔ یہ آپ کا خیر سے نکسالی نام ہے۔

مرزا : اب زیادہ نہ اتر اؤ۔ قصّہ سننے ہو یا کوئی بھتی سننے کو جی چاہتا ہے۔

میں : اچھا اب کان پکڑتا ہوں بچ میں نہیں بولوں گا۔ فرمائیے۔

مرزا : سب سامان لیس ہو گیا تو بڑے حضرت کی سواری آئی۔ دُعا سلام مچرے کے بعد حکم لے کر دریا کی طرف پتنگ بڑھایا گیا۔ دوسری جانب سے معین الملک نظارت خاں بادشاہی ناظر کا، مرزا یا در بخت بہادر یا جس کے لیے پہلے سے ارشاد ہو چکا ہے، پتنگ اٹھا۔ ریتی میں سوار کھڑے ہو گئے۔ پتنگ لڑے، ڈھیلیں چلیں۔ پتنگ یا نکلیں چھپکتی ہوئی چلی جاتی ہیں۔ یا ہاتھ روک کر ڈور دی تو ڈوبتے آسمان سے جا لگیں۔ پیٹا چھوڑ دیا، ڈوریں زمین تک لٹک آئیں، سواروں نے دوشانے بانسوں پر لے لیں۔ پتنگ کٹا تو دریا کے وار پار ڈور پڑ گئی۔ ڈوریں لٹیں۔ پتنگ کے پیچھے پیچھے غول کے غول شاہد رہے تک نکل گئے۔ جس نے وہ تگل یا پتنگ لوٹی پانچ روپے کی مزدوری کی۔ ڈور بھی بیس بیس تیس تیس روپے سیربک جاتی تھی۔ بادشاہ کبھی تو خالی سیر ہی دیکھتے رہتے۔ کبھی جی میں آتا تو تخت رواں سے اتر پڑتے۔ مچھلی کے چھلکوں کے دستانے پہن لیے۔ پتنگ ہاتھ میں لیا، ایک آدھ پتنگ لڑا یا اور ہنستے بولتے محل معلّٰی میں داخل ہو گئے۔ سید! یہ بھی خبر ہے کہ وہ پتنگ یا نکلیں کتنی بڑی اور کیسی محنت سے بنائی ہوئی ہوتی تھیں۔ نکلیں تو تمہارے پیدا ہونے سے پہلے مچھلیں۔ خیر میں کبھی ان

کی تصویر دکھاؤں گا۔ تو وہ قد آدم ہوتی تھی اور ایک ایک کی تیاری میں کئی کئی دن لگ جاتے تھے۔ ڈوریں بھی اک بلی، دو بلی، تیلی، چوبلی کنکوں اور تکلّوں کے زور کے موافق بنتی تھیں۔ مانجھوں کے نسخے بھی ہر گھرانے کے الگ تھے۔ تگلّیں تو تگلّیں آج ویسے پتنگ بھی نہ بنتے ہیں نہ کسی میں اتنا بوتا ہوتا ہے کہ اُن کی جھونک سنبھال سکے۔ چھوٹی تختیں رہ گئی ہیں یا بڑے نامی پتنگ بازوں کے ہاں اڑھے۔ وہ بھی کنکوںے نہیں گڈیاں ہوتی ہیں۔ لنڈوری بن پچھلے کی۔

میں : بھی واقعی لطف تو بڑا آتا ہوگا۔

مرزا : جہاں اپنی حکومت، گھر کی بادشاہت اور پرانی دولت ہوتی ہے، یہی رنگ ہوا کرتے ہیں۔ عشرت گاہوں میں ہر وقت نمازیں نہیں پڑھی جاتیں۔ مجاہدے اور مراقبے نہیں ہوتے، یہ نہ اٹھائیں تو زندگی کی راحتیں کون اٹھائے۔ دنیا میں ہمیشہ یہی ہوتا رہا ہے اور یہی ہوتا رہے گا۔ سلطنتوں کی بھی عمریں ہوتی ہیں۔ جس طرح آدمی کوئی پیٹ میں، کوئی پیدا ہوتے ہی، کوئی بچپن میں، کوئی جوان ہو کر، اور کوئی عمر طبعی طے کرنے کے بعد مرتا ہے، اسی طرح بادشاہتیں ہیں۔ کوئی ایک پشت چلتی ہے، کوئی دو پشت۔ کسی کا سلسلہ سو پچاس ہی برس میں ٹوٹ جاتا ہے اور کسی کی عمارت صدیوں کی خبرلاتی ہے۔ مغلوں نے چھ سو برس تخت کو سنبھالا۔ آخر بڑھاپا تو سب ہی کو آتا ہے۔ اُن کے کندھے بھی شل ہو گئے۔ دنیا کا یہی کارخانہ ہے۔ آج اس کا، تو کل اس کا زمانہ ہے۔ موت اور زوال بہانہ ڈھونڈتے ہیں۔ ہمارے لیے عیش و عشرت ہی بہانہ ہو گئی۔

میں سمجھتا تھا کہ مرزا نرے شہزادے ہیں اور ان کی معلومات میں بازیوں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ آج معلوم ہوا کہ قلعے والوں کا دماغ بگڑی میں بھی کتنا بنا ہوا تھا۔ میں نے کہا ”مرزا صاحب! یہ آپ نے کس فلسفی کا لکچر یاد کر لیا ہے۔ دو چار جملوں میں کیسے کیسے نکلتے حل کر گئے۔“ بولے ”پیارے ہمارے احوال پر نہ جاؤ۔ جان کر دیوانے بنے ہوئے ہیں۔ نہیں تو کیا نہیں جانتے کیا نہیں آتا

عالم میں اب تلک بھی مذکور ہے ہمارا

افسانہ محبت مشہور ہے ہمارا“

_____ اشرف صوبی

سوالوں کے جواب لکھیے:

- 1- مرزا چپاتی کون تھے اور ان کا حلیہ کیا تھا؟
- 2- مرزا چپاتی نے اردو زبان کی جو قسمیں بتائیں ان کے نام اور خصوصیات لکھیے۔
- 3- مرزا چپاتی نے کیوں کہا کہ ”دنیا کا یہی کارخانہ ہے۔ آج اس کا، توکل اُس کا زمانہ ہے۔“
- 4- قلعے کی پٹنگ بازی اور آج کی پٹنگ بازی میں کیا فرق ہے؟



© NCERT
not to be republished

